وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر نفیس بحث

سماع موتی اور حیات انبیاء علیہم السلام کا دلنشین بیان

اضافہ عنوانات

مولانا مدثر جمال تونسوی

دار البصائر

بہاولپور

وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر نفیس بحث

سماع موتی اور حیات انبیاء علیہم السلام کا دلنشین بیان

جمالِ قاسمی

افادت
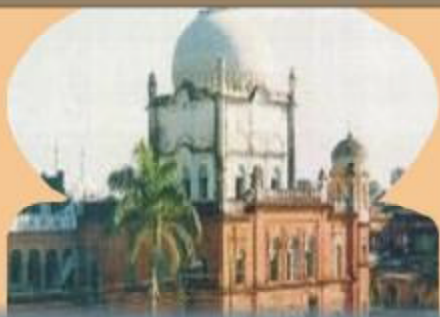
قاسم العلوم والخیرات، حجۃ الاسلام

حضرت مولانا محمد قاسم صدیقی نانوتوی قدس اللہ سرہ

بانیٔ دارالعلوم دیوبند

اضافہ عنوانات

مولانا مدثر جمال تونسوی

دارالبصائر۔ بہاولپور

مشمولات

....

دارالبصائر ۔ بہاولپور

m.ahmad1431@gmail.com

حرفِ ابتداء

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کا نام نامی دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے ہر شخص جانتا ہوگا لیکن آپ کی علمی خصوصیات سے غالباً تمام علماء بھی واقعی طور پر باخبر نہ ہوں گے۔ اللہ تعالی نے آپ کو حکیمانہ ذہن اور عمیق علم عطا فرمایا تھا۔ آپ کے علمی مقام پر ایک غیر جانبدار اور نہایت ثقہ عالم حضرت پیر مہر علی شاہ چشتی گولڑوی قدس سرہ کا شہادت سے بڑھ کر شاید ہی کوئی اور تبصرہ ہو۔ جب حضرت پیر صاحب سے مولنا نانوتوی کے متعلق سوال کیا گیا تو پیر صاحب کا جواب تھا:

''وہ حضرتِ حق کی صفتِ علم کے مَظہرِ اَتَمّ تھے''

(حکایات مہر و وفا، سید نفیس الحسینیؒ)

''جمال قاسمی'' حضرت قدس سرہ کے دو خطوط کا مجموعہ ہے جو آپ نے مولانا جمال الدین دہلوی کے نام تحریر کیے تھے۔ پہلے خط کا موضوع مسئلہ ''وحدت الوجود'' ہے جبکہ دوسرے خط کا موضوع مسئلہ ''سماع اَموات'' ہے اور اسی کے ضمن میں حیات انبیا علیہم السلام پر بھی گفتگو فرمائی ہے۔ مولانا کے یہ دونوں خطوط علم وحکمت کا خزینہ ہیں آپ نے ان موضوعات پر بھی اپنے خاص علمی انداز سے بحث فرمائی ہے جو مختصر ہونے کے باوجود جامع، پُر مغز اور تسلی بخش ہے۔ ان خطوط کے ملاحظہ سے درج بالا دونوں مسائل میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کا اپنا مسلک ومزاج بھی پوری صراحت سے آشکارا ہو رہا ہے جو مطالعہ کنندگان پر خود واضح ہو جائے گا تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔

حضرت حجۃ الاسلام قدس سرہ کے یہ دونوں خطوط آپ کی وفات کے بعد خود مرسل الیہ

مولانا جمال الدین دہلویؒ نے شائع کیے اور خود ہی اس کا نام ''جمال قاسمی'' تجویز کیا۔ بندہ نے اصل کتاب کو جوں کا توں رکھ کر صرف عنوانات کا اضافہ کیا ہے اور مسلسل عبارت کو پیراگرافوں میں تقسیم کر دیا ہے کیونکہ مسلسل مضمون کے سمجھنے اور اسے قابو کرنے میں خاصی دشواری ہوتی ہے

یہاں ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے کہ حضرت قدس سرہ کی چند ادقّ کتابوں کو چھوڑ کر دیگر کتب ایسی نہیں جو تھوڑی بہت محنت اور لگن سے ''قابل فہم'' نہ ہوں۔ منطق وفلسفہ کی مشکل و پیچیدہ کتب کے حل پر جتنی توجہ دی جاتی ہے اگر اتنی توجہ حضرت قدس سرہ کی کتب کی تفہیم و تعلیم پر صرف کی جائے تو اس کے بہت اچھے اور حوصلہ افزا نتائج سامنے آئیں گے اور اس سے حضرت قدس سرہ کے مآثر علمیہ ومعارف حکمیہ کا احیاء بھی ہوگا جو ہم سب منتسبین دیوبند پر قرض ہے۔

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے ہم نے اس سلسلے میں اپنی محنت کا آغاز کر دیا ہے، جس کا ایک مرحلہ ''تصانیف قاسمیہ'' کی جدید واعلیٰ پیمانے پر ترویج واشاعت کا اہتمام کرنا بھی ہے، آپ کی خدمت میں پیش کردہ کتاب ''جمال قاسمی'' مع اضافہ عنوانات، اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق شامل حال رہی تو انشاء اللہ حضرت قدس سرہ کی دیگر تالیفات بھی جدید پیرائے میں پیش کی جائیں گی۔ انشاء اللہ۔

واللہ الموفق للاتمام والتکمیل

مدثر جمال تونسوی

عرض مرتبِ اول

مولانا سید محمد جمال الدین دھلوی نوراللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ الذی اھتدی والصلوۃ والسلام علی رسولہ محمد المصطفیٰ وعلی آلہ واصحابہ المجتبیٰ

اس کے بعد اخلاص آئین فقیر مسکین محمد جمال الدین دہلوی علوی تجاوز اللہ تعالی عن ذنوبہ الجلی والخفی عرض کرتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ایک مخلص محبّ بزرگ مشفق برگزیدہ مولوی حافظ حاجی محمد قاسم صاحب صدیقی نانوتوی حنفی چشتی مرحوم زمانہ کے امامِ حدیث ہونے کے سوا تصوف میں صوفی صافی، فقیر کے نام کے جو خطوط اُن کے لکھے ہوئے تھے اُن کی موجودگی کے استغنائی سے بے احتیاطی نے تلف کردئے اور جو فقیر کی معرفت اکثر خطوط گئے اسی وجہ سے نقل نہ ہوئے، آخر سو رسائل ہندسہ، ہیئت فلاحت طبیعی، جبر و مقابلہ، جرثقیل وغیرہا علوم میں ایک ایک ورق لکھنے کی فرمائش کی۔ بار بار تقریباً مہینے بھر تک مولوی صاحب اصرار کئے گئے کہ ہر رسالہ کی ایک ایک ورق کی قید نہ لگائیے کیوں کہ میں قلم کے ہاتھ سے لاچار ہوں، فقیر نے اس سبب سے کہ یہ یادگار ضرور کم از کم سو جزو سے بڑھ جاوے گی تو بوجہ اپنی بے سروسامانی کے چھپنے سے رہ جاوے گی قلم کے اختیار کی رخصت نہ دی اس باعث یہ کام ناتمام رہا۔ مدت کے بعد ان کے امراض کی

ترقی کی حالت میں وحدۃ الوجود اور سماعِ اموات کا اثبات جس کے اظہار سے بچوائے:

حیف باشد ایں سخن در گوش عام

طوطیا در چشم نابینا کہ کرد

عوام سے چھپایا کرتے تھے بمشکل خطوط کے ذریعہ سے قلم کو رخصت دے کر لکھوا ہی لیا اور آخر عمر کی اس آخری تحریر کی کسی کو خبر نہ ہوئی ۱۲۹۰ھ میں فقیر نے اُن کے شاگرد مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی مدرس دیوبند وغیرہ کو اشاعت کی اُمید پر نقل دیدی وعدہ وفانہ ہوا بہت انتظار کے بعد فقیر نے اپنے رسالہ جمال العارفین کے آخر میں اس کے چھپوانے کا وعدہ کرلیا تھا، سو بفضلہٖ تعالی اب اسے پورا کرتا ہوں ،اس کی تاریخ ''آفتاب ضیاء ، ۱۲۹۵ھ''اور''جمال قاسمی'' سے اسے نامزد کر کے اپنے خاتمہ بالخیر کی استدعا کرتا ہوں، گو ایسے مضامین اور ایسوں کی لڑی کے قابل اپنے آپ کو نہیں جانتا مگر آخر پتے پھولوں کے اور سوت موتیوں اور مصری کے کوزوں کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ رہتے ہیں۔ عجب نہیں کہ ایسوں کے نام کے ساتھ نام رہنے سے یہ نامہ سیاہ بھی ہمیشگی کے ساتھ مستحق ہو جاوے اور اتحاد قدیم کی وجہ سے **المرء مع من احبّ** کا مورد بن جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا مکتوب

مخدوم و مطاعِ نیاز مندان، حامیٔ دین، سلالۂ خاندانِ نبوت

جناب مولوی سید محمد جمال الدین شاہ صاحب مدظلکم!

یہ آپ کا نیاز مند محمد قاسم سلام مسنون عرض کرتا ہے، اور یہ عرض کرتا ہے کہ آپ ہی اول اس تحریر کے باعث ہوئے، آپ ہی کو نقل کرانے کے لئے عرض کرتا ہوں۔

وحدت الوجود کا عوام و خواص کے ہاں مطلب:

مخدوم من! لفظِ وحدۃ الوجود یوں تو ہر خاص و عام کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ پَر اس ایک لفظ کو دیکھا تو باعتبارِ مذاق اور نیز باعتبارِ فہم کہیں اس لفظ کے کچھ معنی ہیں، کہیں کچھ معنی ہیں۔ اہلِ حال اور جو اُن کے کلام کو بے سوچ تصدیق کرتے ہیں، وہ تو وحدۃ الوجود بولتے ہیں اور وحدتِ موجودات مراد لیتے ہیں اور جو لوگ الفاظ سے موافق ہدایت دلالت وضعی، معانی تک پہنچتے ہیں اُن کے یہ معنی کب پسند آئیں گے۔ وہ تو وحدتِ وجود سے وحدتِ صفتِ وجود ہی مراد لیں گے۔ وحدتِ موجودات یعنی موصوفات بالوجود ہرگز اس لفظ سے نہیں سمجھ سکتے۔

وحدتِ موجودات حال اور وحدتِ وجود حقیقت الحال:

جب یہ بات ذہن نشین خدام والا مقام ہو چکی تو اب اس نیاز مند کی بھی سنیئے۔ وحدۃ موجودات تو حال ہے اور وحدۃ وجود حقیقۃ الحال، اول فقط شہود اور مشاہدہ حالی سے متعلق ہے

واقعیت سے اُس کو کچھ علاقہ نہیں اور اسی لئے اس وحدۃ وجود کو اگر وحدۃ شہود کہئے تو بجا ہے، اور وحدۃ وجود بمعنی اتحادِ صفتِ وجود امر واقعی خارجی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ تو اُن لوگوں کا کام ہے جو مغلوب الحال نہیں، حال اُن پر غالب نہیں اور اس لئے اُن کو "ابن الحال" نہیں کہہ سکتے، خطاب "ابوالحال" اُن کو مناسب ہے۔ پَر براہِ استدلال ہم سے خستہ حال بھی اس مضمون تک پہنچ سکتے ہیں۔

صفات کا پھیلاؤ اور اِتصاف کی دو قسمیں:

اس نارسائی پر اتنی رسائی تو ہم سے گناہ گاروں کو بھی حاصل ہے کہ تمام صفات کا پھیلاؤ عالم میں بطورِ عروض ہے۔ شرح اس معما کی یہ ہے کہ اتصاف کی کل دو صورتیں ہیں۔

قسم اول، صفت خانہ زاد ہو:

ایک تو یہ کہ صفت اپنے موصوف سے صادر ہو اور اُس کا موصوف اس کے حق میں "مصدر" ہو یعنی صفتِ مذکورہ موصوفِ مذکور کے حق میں عطاءِ غیر نہ ہو بلکہ "خانہ زاد" ہو۔ مثلاً جیسے مظاہرِ حرارتِ آتش اور نورِ آفتاب، آتش اور آفتاب کے حق میں صفتِ خانہ زاد اور اُنہیں سے صادر نظر آتے ہیں۔ عالم اسباب میں کوئی سبب ایسا نظر نہیں آتا جو آفتاب اور آتش کے حق میں اسی طرح واسطہ حصولِ نور و حرارت ہو جیسے آفتاب و آتش، زمین و آبِ گرم وغیرہما کے حق میں واسطہ حصولِ نور و حرارت ہو جاتے ہیں۔

قسم دوم، صفت خانہ زاد نہ ہو:

دوسری یہ صورت ہے کہ صفت اپنے موصوف پر خارج سے آکر واقع ہوئی ہو، وہ صفت اس

موصوف کے حق میں صفتِ خانہ زاد نہ ہو بلکہ عطاءِ غیر ہو۔ اِس قسم کو عرض کہئے تو بجا ہے اور اس وقوعِ صفت کو عروض کہیئے تو زیبا ہے۔

مصدرِ صفت ایک ہی ہوتا ہے:

اور میں نے جو یہ عرض کیا تھا کہ صفات کا پھیلاؤ عروض سے ہوتا ہے اُس عروض سے یہی عروض مراد تھا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مصدرِ صفت تو ایک ہی ہوتا ہے اور اُسی کو موصوف بالذات اور موصوفِ اول اور موصوفِ حقیقی بھی کہنا چاہیئے ۔ اگر اُس کی وحدت ضروری نہ ہو تو خدا کی وحدانیت بھی ضروری نہیں ہوسکتی۔

خدا کسے کہتے ہیں؟:

مطلب یہ کہ خدا اُس ذات پاک کو کہتے ہیں کہ خود مصدرِ وجود ہو اور سِوا اُس کے اوروں کا وجود اُس کی عطاء ہو، اُس سے صادر ہو کر اوروں پر واقع ہوا ہو۔ سو اگر مصدرِ وصف کی وحدۃ بحیثیت مصدریت ضروری نہ ہوا کرے اور مقتضائے ذات مصدر وحدت نہ ہو تو خدا کی وحدانیت بھی ذاتی اور ضروری نہ ہوگی ۔ اگر ہوگی تو کسی علت خارجہ کے باعث یہ وحدت اور وحدانیت ہوگی ، اور ظاہر ہے کہ جو وصف کسی علت خارجہ کے باعث ہوا کرتا ہے وہ وصف موصوف کے حق میں وصفِ ذاتی بمعنی مقتضائے ذات نہیں ہوتا ورنہ علت خارجہ کی ضرورت ہی کیوں ہوتی۔

وصف عرضی معرض زوال میں رہتا ہے:

بلکہ ایسا وصف بسا اوقات معرضِ زوال میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرارتِ آبِ گرم

جو علت خارجہ یعنی آتش کی بدولت اور نورِ زمین جو علت خارجہ یعنی آفتاب کی بدولت حاصل ہوتا ہے اکثر زائل ہو جاتا ہے۔غرض قیامِ وصف ایسی صورت میں تا قیامِ علت خارجہ ہوتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ مصدرِ وصف اور موصوف حقیقی وہ علت خارجہ ہوتی ہے۔سو وحدانیت مصدر وجود یعنی ذات پاک باری تعالیٰ اگر مقتضائے ذاتِ باری نہ ہوتو پھر یہ وحدانیت کسی اور علت کا فیض ہوگا اور وہی موصوف حقیقی، یا یہ وحدت ہوگی خدا کی وحدانیت حقیقی اور ذاتی نہ ہوگی ۔

ایک وصف کے لیے متعدد مصدر نہیں ہو سکتے:

علاوہ بریں ایک وصف کے لئے متعدد مصدر بمعنی مذکور ہوسکیں تو اُن کا تعدد ایک حرفِ غلط ہو جائے ۔آخر اس قدر تو بدیہی ہے کہ جب صدور مانا تو اول صادر کو مصدر میں ماننا پڑے گا پھر جب ایک صادر ہے اور دو مصدر ہیں تو دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ دونوں وصف صادر کے لئے ایسے ہیں جیسا پانی کا منبع پانی کے لئے یعنی وہ دونوں فقط گذرگاہِ وصف مذکور ہیں، وصف مذکور کہیں اور سے آتا ہے اور ان دونوں میں کو نکل کر باہر چلا جاتا ہے، اس صورت میں تو وہ دونوں مصدر حقیقی نہ ہوئے کیوں کہ اس صورت میں وصف مذکور اُن کے حق میں ''عطاءِ غیر'' ہوا ''خانہ زاد'' نہ ہوا، اور یہ کہنا پڑے گا کہ اُن دونوں میں تعدد حقیقی نہیں بلکہ جیسا شئ واحد کسی کے حساب سے یمین اور کسی کے حساب سے یسار ہو جاتی ہے یہاں بھی تعددِ اعتباری ہے جو باوجود وحدتِ صادریت تعدد ہے۔

وصف صادر واحد ہوگا تو مصدر بھی واحد ہوگا:

الحاصل بشرطِ عقل سلیم یہ بات ضروری التسلیم ہے کہ وصفِ صادر واحد ہوگا تو مصدر بھی واحد ہوگا۔

صدور کو خلق پر قیاس کرنا غلط ہے:

ہاں خلقِ متعدد، واحدِ حقیقی سے اسی طرح متصور ہے جیسے آفتاب سے موافق اشکال مختلفہ روشندانوں اور صحن خانوں کی دھوپ کی شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سو ''صدور'' کو ''خلق'' پر قیاس کرنا اپنی غلطی ہے۔ صدور میں اُسی شیٔ کا وجود ہوتا ہے جو صادر ہوتی ہے اور وقتِ صدور فقط اُس کا ظہور ہوتا ہے اور غیروں کو عطاء کرنا اُس پر موقوف ہوتا ہے، اور خلق یعنی پیدا کرنے میں اول عدم ہوتا ہے اُس کے بعد وجود کی نوبت آتی ہے ورنہ پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ باقی مثال درکار ہو تو نور آفتاب تو آفتاب سے صادر ہے اسی لئے اول آفتاب میں تسلیم کرنا ضرور ہے اور اشکالِ مذکورہ کو آفتاب سے صادر نہیں کہہ سکتے ورنہ اول آفتاب میں اُن سب کا ہونا ضرور تھا، ہاں آفتاب کے باعث اشکالِ مذکورہ پیدا ہو جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کی کثرت کی کیا صورت ہے؟

رہی یہ بات کہ اگر یہی بات ہے، تو پھر تکثر صفاتِ باری کی کیا صورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ صفاتِ باری سب باہم مترتب ہیں، مساوی المراتب نہیں۔ چنانچہ وجود پر تمام صفات کا توقف بدیہی ہے، اِدھر علم پر ارادہ کا تعلق موقوف اور قدرۃ وتکوین کا تعلق ارادہ پر موقوف، اور ظاہر ہے یہ توقف اُسی ترتیب کا ثمرہ ہے۔ اگر باہم ترتب وجودی نہیں تو اس توقف کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں اگر یوں کہیے کہ جو صفات موقوف علیہا ہیں وہ مصدر ہیں اور جو

صفات اُن پر موقوف ہیں وہ اُن سے صادر ہیں تو البتہ یہ توقف بھی ضروری ہوگا یعنی جب ایک صفت دوسری صفت کے حق میں ایسی طرح علت وجود ہوئی جیسے جسم سطح کے حق میں تو جیسے سطح کا تعلق کسی چیز کے ساتھ بے تعلق جسم ممکن نہیں ایسے ہی تعلقِ صفتِ معلولہ بے تعلق اُس صفت کے جو علت ہے ممکن نہ ہوگا۔ سو ہم علت اُسی کو کہتے ہیں کہ جو مصدر ہو۔ بالجملہ صفات باہم مترتب ہیں اور اسی لئے ایک دوسرے کے حق میں مصدر ہے، پَر ذات باری خود بے واسطہ مصدر صفت واحدہ وجود ہے۔

اللہ تعالی کی صفات خانہ زاد ہیں:

یہ صفت (وجود) بے واسطہ اور سوا اُس کے اور صفات بواسطہ بطورِ مذکور خدا کے حق میں خانہ زاد ہیں اور سوا اُس کے اور جہاں کہیں یہ صفات جلوہ افروز ہیں وہ خدا ہی کی عطاء ہے۔

صفت واحد اور موصوفات کثیر ہو سکتے ہیں، ایک مثال:

بالجملہ مصدر وصف تو ایک ہی ہوتا ہے پَر معروض کثیر، اُنہیں کی کثرت صفات کے پھیلاؤ کے حق میں علت ہے۔ اوراس وجہ سے صفات میں وحدۃ ہے اور موصوفات میں تعدد اور کثرت۔ اور اس کی ظاہر مثال جس سے وحدت صفت اور کثرت موصوفات عیاں ہو جائے کشتی کی چال میں سے نکل سکتی ہے۔ یعنی کشتی اگر متحرک ہو تو بالبداہۃ کشتی اور چیز ہے ،اور کشتی نشین اور چیز، پھر اُن میں سے بھی میں اور ہوں اور تم اور، زید اور ہے اور عمرو اور، مگر با ایں ہمہ یہ بدیہی ہے کہ حرکت ایک ہے۔ غرض صفت ایک ہے اور موصوفات متعدد۔ اتنی بات ہے کہ صفت حرکت ایک طرف حقیقی ہے اور دوسری طرف مجازی، ایک طرف سے صادر ہے اور

دوسری طرف وہی واقع۔یہی وجہ ہے کہ کشتی نشین حرکت ،سکون ،سرعت ،بطوئ جہت حرکت ، استقامت واستدارت، حرکت وقت وزمان حرکت میں اُس (کشتی) کے تابع ہیں اگراُس طرف سے یہ وقوع اور یہ عطاء نہ ہوتی تو یہ اتباع بھی نہ ہوتا،استقلال ہوتا۔سویہی صورت وجوداورصفات باقیہ میں سمجھ لیجئے۔

صفت وجودواحداورموجودات متعدد:

اس تقریرمختصر سے وحدت وجودبمعنی وحدت صفت وجودبھی واضح ہوگئی اوریہ بھی واضح ہوگیاکہ جیسے باوجودوحدتِ حرکت متحرک جدا جدا ہیں، کشتی جدا،اورکشتی نشین جدااور پھرکشتی نشین بھی باہم ایک نہیں جدا جدا ہیں ،ایسے ہی واجب الوجودجداہے اورممکن الوجود جدا،اور پھراُن میں سے بھی میں اورہوں اورتم اور۔اوریہ نہ کہیے تو کیا کہیے تمام ہدایتیں غلط ہوجائیں۔

غلبہ محبت میں وحدت شہود بعیدنہیں:

ہاں اگرغلبہ محبت خداوندی میں اگر یہ سب کارخانہ ایک نظرآئے تو دورنہیں ،یرقان کے وقت تمام رنگ ،ہم رنگ نظرآتے ہیں اورسبزسرخ عینک لگالیجئے تو سب رنگ ایک رنگ ہو جاتے ہیں۔وجہ اس وحدت شہود کی بجزاس کے اورکیاہے کہ قوت باصرہ اجزائے صفراوی اور عینک مذکورمیں کوہوکرنکلتی ہےاوراس لئے اُن کا رنگ قوت باصرہ پرعارض ہوجاتا ہے۔سواگر کسی کی محبت تہ دل میں ہوتواُس کی قوت درّاکہ بھی جب کسی چیز پرواقع ہوگی تولاجرم اُس کی قوت درّاکہ کواس کے محبوب میں سے اسی طرح گذار ہوگا جیسے قوت باصرہ کواجزائے صفراوی

اور عینک میں کو گذر رہوتا ہے ۔غرض جو چیز تہ دل میں ہوگی وہ بالضرور بہ نسبت قوت ادراکیہ اوروں سے ورے ہوگی اور اس لئے اوروں کی راہ میں واقع ہوگی ،اور وقت گذار قوت ادراکیہ اُس محبوب کی شکل جو تہ دل میں ہے قوت ادراکیہ پر عارض ہو جائے گی ،اور اس لئے جس چیز پر قوت ادراکیہ واقع ہوگی اُس محبوب کی شکل اُس چیز میں نظر آئے گی ۔مگر ایسی محبت اور کسی محبوب کے ساتھ ممکن ہو کہ نہ ہو۔ پَر خدا کے ساتھ ضرور ممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ میں تمام وجوہ محبت کامل طور سے موجود ہیں:

اول تو جتنی وجوہ محبت ہیں سب اُس میں موجود۔ جمال ،کمال ،احسان ،قرابت۔ مگر قرابت کے یہ معنی نہیں کہ معاذ اللہ بوسیلۂ توالد و تناسل رشتہ و پیوند ہے

نحن اقرب الیه......کا مطلب:

بلکہ مطلب یہ ہے کہ بدلالت "نحن اقرب الیه من حبل الورید" اُس کو قرب حاصل ہے۔ سو جب یہ قربِ انتساب جو بوجہ توسط وجود و سبب پیدائش ماں باپ کو اور بنی نوع سے زیادہ حاصل ہے اور سوا اُن کے اور اقربا کو اُن کے واسطے سے بالواسطہ یہ قرب حاصل ہے۔ اور اس وجہ سے باہم علاقہ محبت ضرور ہے تو وہ قرب جو خدا کو حاصل ہے وہ تو بدرجۂ اولیٰ موجب محبت ہوگا۔

ماں باپ اور اللہ تعالیٰ کے قرب و توسط میں فرق:

کیوں کہ ماں باپ کا توسط تو مثل توسط رنگریز جو کپڑوں کے رنگنے کے وقت ہوتا ہے عادی ہے ضروری نہیں ۔اگر کپڑا ہوا کے باعث خم نیل میں گر جائے تب بھی وہی بات ہے۔ ایسے ہی

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بھی وہی بات تھی جو اور آدمیوں میں ہوتی ہے ،اور خدا کا توسط ایسا ہے جیسا خود رنگ کا توسط سفید کپڑے کے رنگین ہونے میں ۔الغرض یہ توسط علت حقیقی ہے جس کو اصطلاحِ اہل معقول میں واسطہ فی العروض کہتے ہیں اور وہ توسط علت مجازی ہے جس کو اُن کی اصطلاح میں واسطہ فی الثبوت کہتے ہیں ۔اور ظاہر ہے کہ علت اور اس کے معلول میں ایسا قرب ہوتا ہے جو نور میں اور دھوپ میں اور جسم میں اور سطح میں ۔جیسے نور اور دھوپ ،اور جسم اور سطح میں بوجہ شدتِ قرب اور کمال اتصال کسی اور چیز کی بیچ میں گنجائش نہیں ہوتی ایسے ہی وجود باری اور موجودات ممکنہ میں بوجہ کمال قرب کچھ فاصلہ نہیں ہوتا بلکہ جیسے بایں وجہ کہ دھوپ اور سطح ایک انتہاء نور وجسم ہے اور اس وجہ سے اس دونوں (دھوپ اور سطح) کا تعقل اُن دونوں (نور اور جسم) کے تعقل پر موقوف ہے یعنی پہلے اُن (نور اور جسم) کا تعقل ہولے جب کہیں ان (دھوپ اور سطح) کا تعقل ہو۔ایسے حقائق ممکنہ موجودہ ایک انتہاء وجود ہیں اور اس وجہ سے اُن (حقائق ممکنہ موجودہ) کا تعقل اور تصور اُس (وجود حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ) کے تعقل پر موقوف ،اِس کے اول اُس کا تعقل اور تصور ہولے جب کہیں ان کا تعقل اور تصور ہو۔مگر جب یہ ہے تو پھر اگر فرض کرو دھوپ کو عقل عنایت ہو اور وہ اپنے تعقل کے ورے ہو تو اُس کے لئے بھی اول نور کے تعقل کی ضرورت ہوگی پھر اس کے بعد اپنا تعقل نصیب ہوگا ۔اور اس وجہ سے یہ کہنا پڑے گا کہ راہ علم وتعقل وتصور میں نور مذکور دھوپ سے بہ نسبت دھوپ قریب ہے کیوں کہ اول آتا ہے ،اور دھوپ بہ نسبت نور اپنے آپ سے دور۔ایسے ہی بوجہِ مذکور، وجود باری حقائق ممکنہ سے بہ نسبت حقائق ممکنہ نزدیک ہے۔اور اس لئے اگر یوں کہئے کہ ”نحن اقرب الیہ من حبل الورید“ تو بجا ہے۔

قرب والدین موجب محبت ہے تو قرب الٰہی موجب محبت کیوں نہ ہوگا؟

غرض یہ قرب اُس قرب سے جو والدین کو نصیب ہوا ہے کہیں بڑھ کر جب وہ قرب موجب محبت ہے تو یہ قرب بدرجہ اولیٰ موجب محبت ہوگا۔الحاصل تمام وجوہِ محبت خدا میں موجود اور پھر ہر وجہ بوجہ اتم۔اوروں میں اول تو تمام وجوہ موجود نہیں اور جو کچھ ہے تو بوجہ اتم نہیں۔اس لئے اگر نوبت تعلق محبت خدا کے ساتھ آئے تو نہایت شدید ہوگی اور پھر بوجہ قرب مذکور حجاب کی کوئی صورت نہیں۔ایسے ہی حقائق ممکنہ موجودہ فی الخارج اور وجود باری میں حجاب کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے یہ بھی احتمال نہیں کہ کسی طرح اس محبت پر نظروں سے ٹل جائے پھر اس صورت میں اگر بوجہ غلبہ محبت اس قسم کی بات سرزد ہو جائے جس کی طرف یہ شعر مشیر ہے:

سمایا ہے تو میری نظروں کے آگے

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

تو کیا عجب ہے۔

غلبہ محبت میں ایسے الفاظ صادر ہونے پر گرفت کرنا کس کو زیبا ہے اور کس کو نہیں؟

اس پر گرفت اُنہیں کو زیب دیتی ہے جو غلبہ حال یعنی محبت سے آگے نکل گئے ہیں اور حال اور محبت پر غالب آگئے ہیں۔ہم سے بے مغزوں کو یہ طعن و تشنیع جو کٹھ مُلّا کیا کرتے ہیں

زیبا نہیں۔ خطا ہے مگر ہمارے صواب سے بہتر:

ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر است

وحدت وجود امر واقعی ہے:

الحاصل وحدت موجودات ایک امر مشہور ہے امر واقع نہیں، پَر وحدت وجود امر واقعی ہے۔ ورنہ مثل خدا ہر موجود خدا ہو یعنی جب صفتِ وجودِ ممکنات کو فیض خدا نہ سمجھئے اور اُس (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے صدور اور اُن (ممکنات) کی طرف وقوع نہ مانئے تو ہر ایک اپنے اپنے وجود میں مستقل ہوگا اور ہر ایک غنی اور مثل خدا، خدا سے مستغنی، چنانچہ ظاہر ہے۔

طبیعت تھک گئی ہے یہ آپ ہی کا لحاظ تھا جو اس ناتوانی میں کچھ اوپر چار ورق بعد ظہر کل لکھے تھے اور باقی آج لکھے۔ پسند آنے کی یوں تو امید نہیں کہ میں ایک تو کم فہم، دوسرے خستہ جان اور ادھر آپ کی نظروں میں بڑے بڑے کاملوں کے کلام۔ اس لئے یہ استدعا ہے کہ تعمیل ارشاد تو ہو چکی اب اس نامۂ سیاہ کو بعد ملاحظہ آپ واپس فرما دیں۔ اگر بوجہ حسن اخلاق یا حسن ظن رکھنا ہی مد نظر ہو تو جہاں میں نے آپ کی خاطر اس ناتوانی میں سخت جانی کی ہے آپ میری خاطر نقل کی تکلیف اُٹھائیں اور بعد نقل عنایت فرمائیں۔

العبد محمد قاسم

دوم ذیقعدہ ۱۲۹۵ ہجری روز سہ شنبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوسرا مکتوب

مخدوم ومخدوم زادۂ آفاق

جناب مولوی سید محمد جمال الدین شاہ صاحب سلّمکم اللہ تعالیٰ!

یہ آپ کا نیاز مند محمد قاسم اول سلام مسنون عرض کرتا ہے اور پھر یہ عرض کرتا ہے، چند روز ہوئے آپ کا عنایت نامہ میری سرفرازی کا باعث ہوا، اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس تقصیر تاخیر جواب کا عذر عرض کرتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ تا مقدور فی الفور جواب نامہ عرض کرتا ہوں۔ جوابِ سوال بن پڑتا یا نہ بن پڑتا پَر کیا کروں اُن دنوں یہ خستہ جان مبتلائے بلا تھا، داڑھ کے درد نے ایسا بے تاب وتوان کر رکھا تھا کہ کیا عرض کروں۔ اُس کے بعد ناتوانی نے کچھ نہ ہونے دیا۔ وہ کچھ کم ہوئی تھی تو کچھ کچھ اعضاء شکنی اور خفیف سا بخار دمساز رہنے لگا، ہمت تو آج بھی جواب دیتی ہے مگر کب تک یہ انتظار کی جئے کہ طاقت آئے اور نقاہت جائے اور میں جواب لکھوں۔ اپنی معلومات ہی کتنی ہے جس کے واسطے اتنا انتظار کی جئے اور آپ سے انتظار کرایئے جو کچھ ہے ابھی عرض کئے دیتا ہوں۔

سماع اموات سے متعلق چند تنبیہات:

سماعِ اموات کے قصے میں اول تو یہ معروض ہے کہ یہ امر قدیم سے مختلف فیہ ہے، دوسرے ضروریات دینی اور عقائد ضروریہ میں سے نہیں۔ اس کی تنقیح قرار واقعی تو بعد مرگ ہی معلوم ہوگی۔ اگر بعد مرگ ہم نے اوروں کا سلام وپیام سن لیا تو سماع، نہیں تو عدمِ سماع متحقق ہو جائے

گا۔علاوہ بریں طرفین میں بڑے بڑے اکابر، اگر ایک طرف میں بالکل ہو رہئے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو بُرا سمجھنا پڑے گا۔اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں۔جب یہ بات گوش گذار خدام ہو چکی تو اب آگے سنئے

استماع اموات ممکن ہے:

اپنے خیالِ نارسا کے موافق سمعِ اموات، حدِ اسماع سے تو پرے ہے، پَر استماع اموات ممکن ہے۔یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خدا نے توانک **لاتسمع الموتیٰ** فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود اس کے سلام اہل قبور مسنون کر دیا۔اگر استماع ممکن نہیں تو پھر یہ بے ہودہ حرکت یعنی سلام اہل قبور ملحدوں کی زبان درازی کے لئے کافی ہے۔

اجمال کی تفصیل:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کبھی آواز میں ایسی قوت ہوتی ہے کہ بے تکلف ہر صاحب سمع اُس کو سن لیتا ہے اس صورت میں تو سمع سامعین حد اسماع میں ہوتا ہے اور کبھی بوجہ ضعف آواز متکلم سننے والوں کو سر جھکانے اور کان لگانے کی ضرورت پڑتی ہے اِس صورت میں اصل میں تو سمع سامعین حد اسماع سے خارج ہوتا ہے پر بعد سر جھکانے اور کان لگانے کے حد اسماع میں آجاتا ہے، اِس لئے اس کو استماع کہئے اور نفی اسماع کی جئے تو بجا ہے کیوں کہ بوجہ ضعف آواز عدم اسماع تو ظاہر ہے مگر سامعین کی طرف سے اہتمام ہو تو اُن کی طرف سے اخذ اور فعل ہوا، اور ظاہر ہے کہ استماع میں بہ نسبت سماع ایک مضمون اخذ ہوتا ہے چنانچہ خواص ابواب کے

جاننے والے اور محاورات عرب کے پہچاننے والے ان فرقوں کو خوب جانتے ہیں۔

روح کی حیات اور صفات حیات ذاتی ہیں:

یہ مقدمہ تو معروض ہو چکا۔اب آگے چلئے روح کی حیات اور صفاتِ حیات یعنی وہ صفات جو حیات پر موقوف ہیں مثل سمع و بصر، اصلی اور ذاتی ہیں یعنی یہ صفات روح سے صادر ہوتی ہیں اور عالم اسباب میں اس کے حق میں خانہ زاد ہیں، اور جسم کی حیات اور صفات مذکورہ عرضی ہیں یعنی عطائے روح ہیں، روح سے صادر ہو کر اُس پر واقع ہوتی ہیں۔اتنا فرق ہے کہ حیات جو تمام صفات روحانی کی اصل ہے تمام جسم کو محیط ہوتی ہے اور قوت باصرہ اور قوت سامعہ وغیرہ قویٰ خاصہ اعضائے مخصوصہ کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔مگر ہر چہ باداباد، جو کچھ ہے وہ فیص روحانی ہے۔یہی وجہ ہے جب تک تعلق روحانی ہے جبھی تک حیات جسمانی اور صفات روحانی کی بھی جسم میں جلوہ گری ہے ورنہ جیسے قبل تعلق کچھ نہ تھا ایسے ہی بعد انفکاک تعلق بھی کچھ نہیں رہتا۔

تعلق قائم ہونے سے پہلے اور ختم ہونے کے بعد کا فرق:

البتہ قبل حدوث تعلق اور بعد انفکاک تعلق میں اتنا فرق ہوتا ہے جیسے قبل محبت اور بعد فراق میں ہوتا ہے یعنی قبل تعلقِ محبت محبوب سے کچھ تعلق نہیں ہوتا اور جب تعلق محبت ہو چکا تو پھر بعد فراق ہر دم محبوب کا دھیان رہتا ہے اور اس لئے اس وقت جتنی محبوب کی خبر ہوتی رہے گی اُتنی قبل تعلقِ محبت ہرگز نہ ہوتی۔وجہ اس کی وہی ہے کہ اب بطور استماع مذکور ادھر سے تلقی اور اخذ رہتا ہے۔

تعلق محبت اور تعلق روح میں تشابہ کی وجہ:

وجہ اس تشابہ کی تو اسی سے ظاہر ہے کہ روح اصل میں ایک عالم علوی کا نور پاک اور جسم اس عالم سفلی کی ایک مشت خاک اور ظاہر ہے کہ: چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ پھر جو موت یعنی فراق جسم خاکی ناگوار ہے تو وجہ اس کی بجز اس کے اور کیا ہے کہ بوجہ کمال انقیاد و کمال انتفاع وطول صحبت روح کو جسم خاکی سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ کمال انقیاد تو اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ روح کے اشاروں پر کام کرتا ہے اور بے سوچے سمجھے اطاعت میں سرگرم رہتا ہے اور کمال انتفاع اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ تمام قویٰ روحانی بواسطہ اعضائے جسمانی کام کرتے ہیں وہ نہ ہوں تو یہ سب بے کار رہیں، باقی طول صحبت تو خود ظاہر ہے اور اگر طول صحبت بعضے افراد میں نہ ہو تو وہی دو وجہ کافی ہیں۔ اس صورت میں بعد فراق توجہ الی الجسم ضروری ہے اور اس لئے اس کے احوال کی تلقی بقدر امکان قریب الوقوع۔

سماع کا ذریعہ اور سبب کیا ہے؟

جب یہ مقدمہ بھی ذہن نشین ہو چکا تو اصل مطلب سنئے۔ حسب تحقیق اہل عقل سماع احیاء بذریعہ ہوا ہے اور کیوں نہ ہو کوئی دیوار اور چھت اگر بیچ میں حائل ہو جاتی ہے تو بسا اوقات باوجود قرب آواز نہیں پہنچتی اور یوں (یعنی بغیر حائل) دور دور تک جاتی ہے پھر جدھر کی ہوا ہوتی ہے اُدھر زیادہ جاتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ واسطہ وصول آواز متکلم اور موصلِ آواز یہ ہوا ہے مگر چونکہ بظاہر کیفیت وصول یہ ہوتی ہے کہ آواز جو از قسم کیف ہے بمجرد صدور ہوا میں آجاتی ہے اور جیسے پانی میں ڈھیلا مارنے سے چاروں طرف لہریں اٹھتی ہوئی چلی جاتی ہیں ایسے ہی

بجر دصدور آواز ہوامیں وہ کیفیت آ کر چاروں طرف کو پھیل جاتی ہے اور اس وجہ سے گوش سامع تک پہنچ جاتی ہے اس لئے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہوا کی یہ لچک کیفیت آواز کو یوں اُڑاتی پھرتی ہے ۔اگر یہ لچک ہوامیں نہ ہوتی تو یہ پرواز آواز بھی یوں نہ ہوا کرتی ۔

ہوا کی طرح آب وخاک بھی اپنی لچک کے موافق آواز پہنچا سکتے ہیں:

مگر یہ ٹھہری تو پھر یہ بھی یقینی ہے کہ آب وخاک بھی اپنی اپنی لچک کے موافق آواز کو پہنچا سکتے ہیں کیوں کہ ان دونوں میں بھی یہ لچک موجود ہے بہت نہیں تھوڑی ہی سہی ۔پانی کا حال تو خود ظاہر ہے ،رہی یہ خاک اُس کی لچک درختوں کے نکلنے اور کھونٹوں کے گاڑنے سے آشکارا ہے ۔اگر زمین میں قدر قلیل مضمون سیلان یعنی وہ لچک نہیں ہے تو موٹی موٹی جڑوں اور بڑے بڑے کھونٹوں کی گنجایش کی پھر کیا صورت ہے ۔اس لئے یہ ضرور ہے کہ یہ دونوں چیزیں بھی آواز کو تھوڑا بہت پہنچایا کریں ۔ادھر اس خیال کو اپنے ادراک کے مطابق پایا بگھیوں کی کھڑ کھڑ کی آواز زمین میں خود محسوس ہوتی ہے ۔یہ احساس بالبداہت اس پر شاہد ہے کہ زمین بھی واسطہ ایصالِ آواز ہے البتہ وہ بات نہیں جو ہوامیں نظر آتی ہے ۔القصہ زمین بھی آواز کو پہنچاتی ہے مگر بہت کم ۔

موت کے بعد روح کا جسم سے تعلق:

ادھر بعد مرگ روح کو جسم خاکی سے بہت کم علاقہ رہ گیا اور جو کچھ تھا بھی تو جسم مذکور کی شکل وصورت کے بگڑ جانے نے اُس کو اور بھی گھٹا دیا یعنی بعد مرگ وہ علاقہ تسلط تو باقی نہ رہا یہی وجہ

ہے کہ بعدمرگ جسم و اعضاء جسمانی سے روح کچھ کام نہیں لے سکتی۔ البتہ علاقہ محبت باقی تھا سوشکل وصورت کے بگڑ جانے نے جوسبب عظیم نفرت ہے اُس محبت کواور بھی کم کر دیا کیوں کہ نفرت ہوئی تو وہ رغبت کہاں جومحبت کولازم ہے۔ الغرض اِدھرتوروح کوجسم سے وہ تعلق ضعیف ہوگیا جوسرمایۂ اِبصارواِسماع تھا اُدھرواسطۂ ایصال بعددفن آب، خاک ہے جس میں خفیف سی لچک اورقلیل سا سیلان ہے اس لئے خوہ مخواہ یہی کہنا پڑے گا کہ حدقوت اسماع متکلم سے قوت سامعہ اَموات جوبالفعل فقط روح کے ساتھ قائم ہے اورجسم سے چنداں تعلق نہیں بَری ہے۔

یہ خفیف تعلق بھی کافی ہے، اسی لیے سلام مسنون ہوا:

پَر بایں ہمہ تعلق بھی موجود ہے گوضعیف ہے اورواسطۂ وصولِ آواز میں سیلان اور لچک بھی موجود ہے گوخفیف ہے اس لئے اگراُدھر سے بوجہ توجہ واقتراب جومحبت مذکورہ کولازم ہے تلقی آواز یعنی استماع ہوتو بعیدنہیں اس لئے مناسب یوں ہے کہ قبرستان میں گذرے تو سلام سے دریغ نہ کرے اوربن پڑے توہدیہ مناسب وقت بھی پیش کرے ورنہ سخت بے مروتی ہے جو یوں آنکھیں چرائے چلاجاوے۔

اس بارے میں عوام کوکیا تعلیم دی جائے؟

مگر چونکہ محتاج اور مستغنی محتاج الیہ کاپکارنا جدا جدا ہوتا ہےاورعوام اپنے خیال خام میں اولیاء کوقادراورمتصرف یعنی غنی محتاج الیہ سمجھتے ہیں تو اگراس زمانہ میں اس امکان استماع کا بھی چرچا کیا جائے تواس غُل سے نفع دینی تو کچھ متصورنہیں البتہ قوت مضامین شرکیہ کا گمان غالب ہے اس لئے یوں مناسب ہے کہ عوام کوفقط طریقہ مسنونہ زیارت قبور تعلیم کیا جائے اوراس سے

زیادہ کی اطلاع نہ ہونے دے ورنہ اس علم امکان سے ترقی مدارج تو معلوم کیوں کہ ضروریات دینی میں سے نہیں البتہ مؤاخذہ نقصان مذکورہ کا احتمال ہے۔

حیات انبیاء علیہم السلام:

جب یہ سب باتیں نذر خدام ہو چکیں تو اس ذیل میں وہ مضمون بھی عرض کئے دیتا ہوں جو فی الجملہ ماقبل سے مناسب ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبہ کو بعد مرگ بھی وہی تعلق اپنے اجسام سے رہتا ہے جو قبل مرگ تھا یہی وجہ ہے کہ اُن کے اجساد مثل اجساد احیاء پھوٹتے پھٹتے نہیں چنانچہ احادیث میں موجود ہے اور یہی وجہ کہ ان کے ازواج مثل ازواج احیاء اوروں سے نکاح کرنے کا اختیار نہیں رکھتے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے اموال کو مثل اموال احیاء اُن کے وارث نہیں کر سکتے۔

چند تعارضات کا جواب:

اوراس وجہ سے حدیث **لانورث** کو معارض آیت **یوصیکم اللّٰہ**، اور آیت **لاتنکحوا ازواجه من بعده ابدا** کو معارض آیت **والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا** نہیں کہہ سکتے کیوں کہ آیت **یوصیکم اللہ** اور آیت **والذین یتوفون** کے مصداق وہ ہیں جن کی ارواح کو اُن کے ابدان کے ساتھ وہ تعلق نہ رہا ہو جو حالت حیات میں تھا چنانچہ **للرجال نصیب مماترک الوالدان** میں لفظ **ترک** اور آیت **والذین یتوفون** میں مادہ **توفی** اس پر شاہد ہے۔ علی ہذا القیاس آیت **ولیخش الذین لوترکوامن خلفهم ذریة ضعافا** میں لفظ **ترکو** اقرینہ مضمون معروض ہے کیوں کہ جیسے مضمون **توفی** جبھی چسپاں ہو

سکتا ہے جب کہ کوئی چیز نکال لی جائے اور یہ بات یہاں اسی وقت صحیح ہوتی ہے جب روح کو بدن سے نکال باہر کی جیئے کیوں کہ الذین کا مصداق آیت و الذین یتوفون میں وہی ہے اور نیز وہ نہ ہوتو جسم ہوااور ظاہر ہے کہ جسم مورد تــوفـــی وقت مرگ نہیں ہوتا اس لئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ روح کو ایسے لوگوں کی اپنے جسم سے وہ علاقہ نہیں رہتا جو وقت حیات تھا، ایسے ہی مضمون تــرک بھی گرفتاران محبت اولاد واموال کے حق میں جبھی صحیح ہوسکتا ہے جب کہ اس خاکدان سفلی کو چھوڑ کر عالم علوی کو چلے جائیں ،سو یہ بھی جبھی متصور ہے جب کہ روح کو وہ تعلق اول نہ رہے ورنہ وہ ترک نہیں بلکہ مثل بندیوان دست و پابستہ ملاقات اولاد وتصرف اموال سے مجبور ہیں یہی وجہ ہے کہ قیدیوں کے ازواج واموال ان کی ملک سے خارج نہیں ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ سکتہ والے کے ازواج واموال بدستور اُس کے مِلک میں باقی رہتے ہیں اِن دونوں میں فرق اتنا ہے کہ قیدیوں کے اجسام مقید ہوتے ہیں اور سکتہ والے کی روح مقید ہوجاتی ہے مگر اُس کا قید خانہ یہی جسم خاکی ہوتا ہے اس لئے وہ پھیلاؤ جو بذریعہ ظہور افعال اختیاریہ ہوا کرتا ہے اور نور آفتاب وقمر کے پھیلاؤ کے مشابہ ہوتا ہے ایسی طرح بند ہوجاتا ہے جیسے چراغ پر کسی ظرف کے رکھ دینے کے وقت اُس کے نور کا پھیلاؤ بند ہوجاتا ہے۔

حیات انبیاء علیہم السلام کی کیفیت:

سو یہی صورتحال بعینہ انبیاء علیہم السلام کی موت کی سمجھئے ۔اتنا فرق ہے کہ سکتہ میں سوائے بعض مواقع تمام اعضاء میں سے روح کھینچ لی جاتی ہے اور تمام قوائے روحانی کو مثل قوت سامعہ وقوت باصرہ اپنے اپنے مواقع سے کھینچ لیتے ہیں اور اس وجہ سے اگر تدبیر مناسب نہ بن پڑے تو رفتہ رفتہ بالکل کھینچ کر باہر کردیتے ہیں اور ارواح انبیاء کو بدن کے ساتھ علاقہ

بدستور باقی رہتا ہے۔ پَر اطراف و جوانب سے سمٹ آتی ہے اور اس لئے حیات جسمانی کو بہ نسبت سابق ایسی طرح قوت ہو جاتی ہے جیسے ظرف مذکور کے رکھ دینے کے بعد چراغ کے شعلہ میں نورانیت بڑھ جاتی اور سکتہ میں ایسا ہو جاتا ہے جیسے فرض کی جئے چراغ ٹمٹانے لگے اور گل ہونے کو ہو بہر حال ارواح انبیاء کو بدستور اپنے ابدان کے ساتھ تعلق رہتا ہے بلکہ کیفیت حیات بعد بوجہ اجتماع مدت اور ہی قوت آجاتی ہے اور مثل نور چراغ و ظلمت ظرف محیط حیات و موت دونوں مجتمع ہو جاتے ہیں۔

اجتماع اضداد کے شبہ کا حل:

اور اس سے بھی روشن مثال اجتماع اضداد کی ضرورت ہو تو آب گرم کی گرمی عارضی اور برودت طبعی کو پیش نظر رکھ کر اپنے اطمینان فرما لیجئے یا ادویہ حارہ کی برودت خارجی اور ادویہ باردہ کی حرارت خارجی پر نظر ڈالئے اور وہم عموم استحالہ اجتماع اضداد کو دل سے نکالئے۔ شرح اس کی یہ ہے کہ آب گرم کی برودت طبعی وقت حرارت بھی موجود ہے یہی سبب ہے کہ آگ کو بجھا رہی ہے اگر وہ برودت نہ تھی تو یہ آتش کشی کیوں ہے، علی ہذا القیاس ادویہ میں وقت عروض کیفیت مخالف طبعیت اگر طبعیت اصلی باقی نہیں رہتی تو یہ تاثیر کیوں ہے القصہ اگر ایک ضد طبعی اور ذاتی ہو اور دوسری خارجی عارضی ہو تو پھر یہ اجتماع محال نہیں بلکہ کثیر الوقوع۔ ورنہ کارخانہ عروض بالکل باطل ہو جائے۔ عروضِ اوصاف وہیں ہوتا ہے جہاں اُن اوصاف کی اضداد ہوتی ہیں، زمین میں ظلمت اصلی ہے نور تو اس پر عارض ہوتا ہے۔ ہاں یہ محال ہے کہ دونوں وصف متضاد عارضی یا طبعی ہوں اور پھر مجتمع ہو جائیں۔

انبیاء کا سماع بعد وفات بدستور باقی رہتا ہے:

مگر یہ ہے تو پھر قوت حیات جس کو قوت سامعہ کی قوت بھی لازم ہے انبیاء میں اس بات کو مقتضی ہے کہ اس قوت کا تعلق قوت سامعہ سے اُس ضعف واسطہ کا تدارک ہو جائے اور اُن کا سماع بعد وفات بھی بدستور باقی رہے۔

شہداء کی اَزواج واَموال ان کی مِلک سے کیوں نکل جاتے ہیں حالانکہ ان کی حیات بھی منصوص ہے؟:

اب اگر کسی کو حیات شہداء کا خیال آئے اور اس وجہ سے کچھ اور خیال آئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حیات شہداء اجسام یعنی اجواف طیر خضر کے اعتبار سے ہے چنانچہ حدیثوں میں مصرح ہے اور قرآن میں لفظ عند ربھم جو احیاء کے ساتھ اُس طرف مشیر ہے اور جب حیات شہداء کی یہ کیفیت ہے تو ان کے ازواج واموال اوروں کے ازواج واموال کی طرح بمجرد مرگ اُن کے مِلک سے نکل جائیں گے۔

اَزواج کو نکاح ثانی کیلیے کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟

البتہ ازواج کو نکاح ثانی میں اتنا انتظار کرنا پڑے گا جس میں احتمال اختلاط نطفۂ شوہر اول وشوہر ثانی نہ رہے، سو وضع حمل میں تو یہ بات ظاہر ہی ہے اور دس دن چار ماہ میں بایں وجہ کہ چار ماہ کے تین چلے ہوتے ہیں اور موافق ارشاد نبوی تین چلہ کے بعد نفخ روح کی نوبت آتی ہے اور دس دن میں کسی قدر قوت حرکت آ ہی جائے گی جس سے حمل ہو گا تو یقینی ہو جائے گا یہ بات یوں

ٹھیک ہو جاتی ہے کہ بوجہ ظہورحرکات جو اعلی درجہ کا ظہور ہے حمل کا تیقن ہو گیا تو موافق آیت **واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن** انتظار وضع حمل کیا جائے گا ورنہ بوجہ عدم حمل بے اندیشہ ہوکر جو چاہو سو کرو۔ غرض ان دونوں آیتوں میں جو بظاہر درباره میعاد عدت مختلف معلوم ہوتی ہیں اختلاف نہیں بلکہ منشاء دونوں آیتوں کا وہی نطفوں کے اختلاط کا بچاؤ ہے اتنا فرق ہے کہ وضع حمل کے بعد خلورحم کا یقین تھا اور اس لئے اختلاط کا احتمال ہی نہ تھا وہاں تو بطور قطع یہ فرمادیا **اجلھن ان یضعن حملھن** اور دس دن چار ماہ میں اتنا معلوم ہوجاتا تھا کہ حمل ہے کہ نہیں اس لئے **تربص** ارشاد ہوا جو بمعنی انتظار ہے۔ الحاصل ازواج (شہداء) مثل ازواج دیگر اموات اُن کی مِلک سے نکل جاتی ہیں اور مثل ازواج دیگر اموات عدت متعینہ تک اُن کو ممانعت نکاح ہے پَر یہ ممانعت جیسے بوجہ بقاءِ ملک اور اموات نہیں بلکہ بوجہ اختلاط اندیشۂ نسب ہے تاکہ احکام صلہ ومیراث ونکاح وسفر میں کچھ آمدرفت پیش نہ آئے اور موافق ارشاد **جعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا** احکام مذکورہ میں حقیقت الحال معلوم رہے کچھ اشتباہ نہ ہو۔

شہداء اور عام اَموات:

اور وجہ تساوی کی جو شہداء اور اموات باقیہ میں ملحوظ رہی وہی ہے کہ اس بدن کے اعتبار سے دونوں کی موت برابر ہے یعنی دونوں یہاں کے جسم سے بے علاقہ ہو جاتی ہیں بلکہ شہداء کی بے تعلقی کچھ زیادہ ہو تو تعجب نہیں کیوں کہ اُن کو جب نعم البدل عنایت ہو گیا تو اب اس جسم کی محبت کیا رہی ہوگی اس لئے اُن کے سماع اور اُن کی قبور سے استفاضہ زیادہ مستبعد ہے اور اُن کی ازواج واموال زیادہ تر قابل اجازت غیر ہیں کیوں کہ احتمال استماع بوجہ بقاءِ محبت تھا اور امکان فیض بھی اُسی محبت اور توجہ پر مبنی تھا اور ازواج واموال سے قطع امید اغیار باین نظر تھی کہ ازواج

تو موافق ارشاد ''نسائکم حرث لکم'' مزرعۂ اولاد ہیں اور ظاہر ہے کہ تخم اولاد یعنی نطفۂ والد جو اس مزرعہ میں بویا جاتا ہے وہ موافق قاعدۂ نباتات اسی جسم سے پیدا ہوتا ہے۔ علی ہذا القیاس اموال جو موافق ارشاد جعل اللّٰہ لکم قیاما اور نیز بالبداہت بغرض حفظ جسم خاکی یا مرمت جسم خاکی عنایت ہوا ہے اسی بدن کے لئے ہے۔

ایک بہترین مثال:

سو جیسے گھوڑا ہے تو گھاس دانہ کا بھی فکر ہے اور وہ نہ رہے تو ان سے بھی مطلب نہیں رہتا ایسے ہی یہ بدن ہے تو ازواج واموال سے بھی تعلق ہے اور اس بدن ہی کو چھوڑ گئے تو پھر اُس کے متعلقات سے کیا مطلب رہ گیا؟ اس لئے یوں مناسب ہے کہ یہ خدا کی نعمتیں بے وجہ بے کار نہ رہیں یعنی اموال کو اس کے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ازواج کو اجازت ہو جائے کہ وہ اپنا فکر خود کر لیں۔

انبیاء علیہم السلام اور عام اَموات میں ایک فرق:

مگر اور لوگ تو سب کو چھوڑ جاتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام فقط مال کو چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ ازواج دینے کے قابل ہی نہیں جو چھوڑ دیجئے بالجملہ اموال کو چھوڑ دیتے اور اموات باقی ازواج اموال دونوں کو چھوڑ جاتے ہیں چنانچہ وقت موت اوروں کی مجبوری اور انبیاء کی خودمختاری جس پر اُن کی رضا سے اُن کی ازواج مقبوض ہونا دلالت کرتا ہے اس فرق پر شاہد ہے اور ظاہر ہے کہ چھوڑ جاتے ہیں تو جانے کی ضرورت میں چھوڑنا پڑتا ہے ورنہ اصل میں چھوڑنا ناگوار ہوتا ہے اور چھوڑ دینے میں دینے کے لئے باختیار خود چھوڑتے ہیں سو اسی فرق کے اظہار کے لئے آپ

نے ارشاد فرمایا: ماترکناہ صدقة تاکہ لفظ صدقہ چھوڑ دینے پر دلالت کرے اور کسی کو چھوڑ جانے کا وہم نہ ہو جو انجام کار یہ وہم نہ ہو کہ ترک ہے تو مماترک میں آپ کا متروکہ بھی داخل ہو گیا اس لئے یوں مناسب ہے کہ موافق ارشاد یوصیکم اللہ اُس میں بھی میراث جاری ہو کیوں کہ چھوڑنا جو مفہوم ترک ہے گو دونوں میں مشترک ہے مگر وہی فرق ہے جو میں نے عرض کیا اسی لئے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ صدقہ سے ایک قسم ترک کو متعین کر دیا ایسے ہی لفظ للرجال نصیب وللنساء نصیب سے خدا نے اوروں کے حق میں قسم ثانی ترک کو معین کر دیا۔ علی ہذا القیاس آیت ولیخش الذین بقرینۂ خافوا علیھم میں قسم ثانی کی تخصیص فرما دی۔

اس فرق کی تشریح:

شرح اس معما کی یہ ہے کہ خوف اُسی وقت متصور ہے جب کہ بہ مجبوری چھوڑ کر جایئے۔ اور باختیار خود چھوڑ دیجئے تو کیا خوف ہے جو چیز اوروں کو دے بیٹھتے ہیں وہ ضائع ہو یا باقی رہے اُس کا کیا خوف۔ علی ہذا القیاس اموال کو باختیار خود ہم وقت مرگ چھوڑ دیا کریں تو جس کو ہم دے جایا کریں وہ اُسی کا ہے جیسے ایام حیات کے تصرفات میں خدا کو کچھ مزاحمت نہ تھی اس صورت میں وقت مرگ بھی خداوند عالم دخل نہ دیتے مگر یہ ارشاد اُسی بنا پر ہے کہ اموات اپنے اموال کو چھوڑ کر جاتے ہیں، چھوڑ دینا نہیں ہے چنانچہ موت کی مجبوری خود اس پر شاہد ہے کہ دل خستہ بدستور لبریز محبت ازواج واموال واولاد ہے پھر کیوں کر کہہ دیجئے کہ ہم چھوڑ دیتے ہیں نہیں یہ چھوڑ جانا ہے۔ سو یہ چھوڑ جانا اسی وقت متصور ہو کہ جسم سے اخراج روح ہو اور جس قسم کا اُس کا دخول تھا جس پر یہ تمام آثار تسلط یعنی باختیار خود جسم اور اعضائے جسم سے کام

لینا دلالت کرتا ہے اس کے مناسب خروج متحقق ہو جائے سو یہ بات بدلالت فرق احکام مذکورہ اور اموات میں تو ہوتی ہے۔ پَر انبیاء میں نہیں ہوتی۔

ارواح انبیاء علیہم السلام کا اِخراج نہیں ہوتا:

یعنی بقاء اجساد انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ضروری ہونا اور سوا اُن کے اوروں کے لئے ضروری نہ ہونا اور ازواج انبیاء کرام علیہم السلام کو نکاح ثانی کی اجازت کا نہ ہونا اور اوروں کی ازواج کے لئے اس اجازت کا ہونا اور اموال انبیاء کرام علیہم السلام میں میراث کا جاری نہ ہونا اور اوروں کے اموال میں جاری ہونا اس پر شاہد ہے کہ ارواحِ انبیاء کرام علیہم السلام کا اخراج نہیں ہوتا فقط مثل نور چراغ اطراف و جوانب سے قبض کر لیتے ہیں یعنی سمیٹ لیتے ہیں اور سوا اُن کے اوروں کی ارواح کو خارج کر دیتے ہیں اور اس لئے سماعِ انبیاء کرام علیہم السلام بعد وفات زیادہ تر قرین قیاس ہے۔

وفات کے بعد انبیاء کرام کی زیارت (یعنی ان کی قبور کی زیارت) ممنوع نہیں ، اور حدیث ''لاتشدالرحال ......'' کا جواب:

اور اِسی لئے اُن کی زیارت بعد وفات بھی ایسی ہی ہے جیسے ایامِ حیات میں اَحیاء کی زیارت ہوا کرتی ہے اور اِس وجہ سے یوں نہیں کہہ سکتے کہ زیارت نبوی ﷺ مثل زیارتِ مسجد ،زیارتِ مکان ہے اور اِسی وجہ سے بحکم **لا تشدوا الرحال** وہاں اس اہتمام سے جانا ممنوع

ہے بلکہ وہ زیارت مکان نہیں زیارت مکین ہے۔سو اگر **لا تشدوا الرحال الی مسجد** محذوف نہ ہو بلکہ **الیٰ مکان** ہی محذوف ہو، جنس قریب مستثنیٰ نہیں بلکہ جنس بعید مستثنیٰ لیں اور وجہ یہ ہو کہ وجہ ممانعت یہ ہے کہ محنت بے سود ہو گی۔ سو زیارت جملہ مکانات میں خواہ مسجد ہو خواہ کچھ اور سوائے مساجد ثلاثہ جن کا ثواب عظیم ظاہر ہے یہ وجہ برابر ہے تب بھی زیارتِ نبوی ﷺ میں کچھ حرج نہیں بلکہ اُس ترحم کی امید ہے جس کا نتیجہ مغفرت اور رضوان خداوندی نظر آتا ہے کیونکہ یہ زیارت مکان نہیں زیارت مکین ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں عنایت فرما کر اس تحریر کی نقل یا خود یہ اصل عنایت فرمائیں ورنہ ایام نقاہت کی یہ کارگزاری انجام کار بہت دشوار معلوم ہو گی۔زیادہ بجز التماسِ دعا اور کیا عرض کروں۔میری کیفیت یہ ہے کہ ایک مدت سے کسی نہ کسی مرض میں مبتلا رہتا ہوں، دعا کا محتاج۔ باقی بیماری کی اس نواح میں کثرت ہے۔حاضرینِ خدمت کی خدمت میں سلام۔

العبد محمد قاسم

سوم ذیقعدہ ۱۲۹۵ ہجری نبوی (علی صاحبہ الصلوۃ والسلام) روز چہار شنبہ

ادارۃ العلم والتحقیق

دار البصائر، ریلوے لنک روڈ، بہاولپور

m.ahmad1431@gmail.com